نجیب محفوظ کی تخلیقی حسیّت

ڈاکٹر سفیر حیدر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Najeeb Mehfooz is a great novelist of Egypt. He is called Balzac of Arab because of his realistic writing style. In this article, his contemporary social sensibility is discussed with reference to his novel.

مصر کے بالزاک کہلانے والے، نوبل انعام یافتہ نجیب محفوظ کی فنی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے کہ:

"محفوظ کے پاس وہ دانشواری اور ادبی صلاحیت موجود ہے جس کے ذریعے وہ اپنے ملک کے تعلق سے اپنے توانا، براہ راست اور نکتہ سب اسلوب میں اظہار کر سکتا ہے۔"[۱]

ایڈورڈ سعید کے ان الفاظ کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ "چور اور کُتے" کو بطور نفسیاتی ناول شناخت کیا گیا ہے۔ یہ انتقام کی بھول بھلیوں میں ہر لحظہ منہ کے بل گرتے "بیمار" آدمی کی کہانی ہے جس کا دوست اس کی بیوی کو ہتھیا لیتا ہے۔ جس کی معصوم بیٹی اُس کو پہچاننے سے قاصر ہے، جو جوانی کے چند سال جیل میں گزار کر باہر آیا ہے اور انتقام کے جذبے سے سرشار ہے۔ بقول ٹریور لی گیسک:

"محفوظ نے پہلی بار شعوری حکمت عملی استعمال کرتے ہوئے ذہنی عذاب کو دکھایا ہے کہ ایک شخص، فرد واحد اور معاشرے سے کس تلخی کے ساتھ بدلہ لینا چاہتا ہے جو اُسے اخلاقی بگاڑ پہ مجبور کرتے اور دھوکہ دیتے ہیں۔ اس طرح اسے یقینی طور پر عذاب ابدی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ انتہائی ماہرانہ کام ہے جو قاری کو تیز اور درست شعور عطا کرتا ہے کہ ایک بیمار اور مشتعل ذہن خود کو کس طرح تباہی کے دہشت ناک انجام تک پہنچاتا ہے اور جب وہ متوقع طور پر کہانی کے اصل کردار کی حقیقت اور مایوسیوں سے واقف ہوتا ہے تو اس وقت مصری معاشرتی ڈھانچے کا ادراک کر لیتا ہے۔"[۲]

"چور اور کُتے" مختصر مگر گہری وجودی نفسیات اور سماجی بصیرت کا مظہر ناول ہے۔ اس میں شامل بلیغ جملے نجیب محفوظ کے اسلوب میں پنہاں معنوی دبازت اور کثیر تعبیروں کے حامل ہیں۔

"ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارا دشمن ہمارا دوست بھی ہے۔"[۳]

''اُس کے برعکس یہ کہ ہمارا دوست ہمارا دشمن بھی ہے۔''[۴]

مندرجہ بالا مکالمہ صرف مرکزی کردار کی ذاتی واردارت کا بیان ہے بلکہ عالمی سیاسی منظر نامہ بھی دو سطروں میں سمٹ آیا ہے۔اسی طرح جب سید چند سال جیل میں گزارنے کے بعد ایک ہوٹل میں جاتا ہے اور اس کا دوست اُسے پرانی شناسا،نور سے ملنے کا مشورہ دیتا ہے تو سید بے ساختہ کہتا ہے۔''

''اس سے ملنا بہتر ہوگا۔یہ دیکھنے کے لئے کہ وقت نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔''[۵]

یہاں وقت کے بہاؤ کے آگے انسان کی ازلی بے بسی کو مکمل اختصار مگر کس قدر کرب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔جدید زندگی میں پیسے نے آکسیجن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ناول کے آغاز میں سید جب بے سروسامانی میں جیل سے واپس آجاتا ہے تو سوچتا ہے۔

''مجھے اس سے ملنا چاہیے۔شیخ نے مجھے ایک چٹائی دی ہے سونے کے لیے،لیکن مجھے تو پیسے درکار ہیں۔ مجھے نئے سرے سے زندگی کی ابتداء کرنا چاہیے۔مسٹر علوان اس مقصد کے حصول کے لئے تم بھی اہم ہو شیخ علی کی طرح، بلکہ جو سچ پوچھو تو تم اس غیر محفوظ دنیا میں انتہائی اہم ہو۔''[۶]

بے پناہ غیر محفوظ دنیا میں سید کے لئے دو دروازے ہمیشہ کھلے رہے،شیخ اور نور کی پناہ گاہیں۔شیخ کا سہارا روحانی جبکہ نور کے دل میں سید کے لئے سدا بہار محبت کا جذبہ ہے۔جس کی منزل نُور کے لئے شادی ہے۔

شیخ اشاراتی زبان میں سید کو انتقام کی راہ سے ہٹانے اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دینے کی تجویز دیتا ہے۔لیکن سید اپنے باپ کے برعکس شیخ کی باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے کیونکہ وہ اس قدر جنون کی زد میں ہے کہ اب اس کی سماعت پتھر کی دیوار میں تبدیل ہو چکی ہے اور کلام نرم ونازک اپنا اثر نہیں چھوڑ سکتا۔شیخ کے یہ رمزی جملے سید کو انتقام، ناحق خون خرابے یا قتل وغارت کی راہ سے واپس نہیں لا سکتے۔

''میرے آقا نے کہا تھا، میں روزانہ آئینے میں خوف کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ کہیں میرا چہرہ سیاہ تو نہیں ہو گیا!.....''

''جاؤ سو جاؤ کیونکہ تم جیسے لوگوں کے لیے سونا ہی عبادت ہے.....''

''تم بہت دیر سوتے رہے لیکن تم آرام سے ناواقف ہو بالکل اسی طرح جیسے ایک بچہ گرم سورج کی آگ کے نیچے پڑا رہتا ہے۔تمہارے جلتے ہوئے قلب کو سائے کی ضرورت ہے۔اب بھی سورج کی آگ کی طرف بڑھتے جا رہے ہو۔کیا تمہیں ابھی تک چلنا نہیں آیا؟''[۷]

اسی طرح سید اُس داخلی انتشار اور روحانی خلاء (جو کہ ناقابل علاج ہے) کا شکار ہے۔جس کے پس منظر میں ایک عورت (بیوی) کی بے وفائی بھی کار فرما ہے۔وہ نور ایسی مخلص عورت،جس پر خود اُسے بہت اعتماد بھی ہے، کے ساتھ نئی زندگی کا خواب دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

''ہمارے پاس اب بھی موقع ہے۔''

’’فرار! سوچو کہ ہم فرار کس طرح ہو سکتے ہیں۔‘‘

’’ہاں میں سوچوں گا۔لیکن انتظار کرو کُتے اپنی آنکھیں کب بند کرتے ہیں۔‘‘۸؎

سید کے کردار کو محض ایک جنونی قرار دے کر بات ختم نہیں کی جاسکتی۔اُس کے جنون کے پس منظر میں بیسویں صدی کی معاشرت، جو اپنے باطنی خلاء کے نتیجے میں شدید مادی دباؤ کی زد میں ہے، بے نقاب ہو جاتی ہے۔ زر پرستی کو کوکھ سے جنم لینے والے ’عزت مآب‘ اپنے جیسے انسانوں کو اس درجہ بے رحمی سے کچل دیتے ہیں کہ عام سے لوگ اپنے بے ضرر وجود کے ساتھ بھی اس آباد خرابے میں زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتے۔سید اپنی ذاتی محرومیوں اور استحصال کے انتقام کے ساتھ ساتھ اپنے تئیں اس ’’نروان‘‘ تک پہنچتا ہے کہ چند کالی بھیڑوں کا خاتمہ اس کی ذات کو وسعت دے سکتا ہے۔وہ جب سنتا ہے کہ مذہبی پیشوائی کے عہدے کے لیے کسی دہشت گرد کی سفارش بھی کارآمد ہو سکتی ہے تو وہ شیخ سے عجیب مخمصے، معصومیت اور دبے دبے غصے سے پوچھتا ہے:

> ’’حکومت مذہبی معاملات میں کیوں دخل دیتی ہے؟ اس نے سوال کیا۔شیخ نے وضاحت کی کہ یہ سب کچھ عظیم طاقت رؤف علوان کی سفارشات پر ہوا ہے، جس پر سید نے اعتراض کیا کہ رؤف سب سے بڑے دہشت گرد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔جس کے خیالات جرم سے پُر ہوا کرتے ہیں۔ جس پر شیخ نے برجستگی سے جواب دیا کہ یہی وجہ ہے جو ایسے ہم منصب کے لیے اس کی سفارش کی گئی ہے۔‘‘۹؎

انتقام سید کے لئے محض ایک جنون نہیں بلکہ اپنی بے معنی زندگی کو معنی دینے کا راستہ بھی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ تمام لوگوں کی اکثریت کا حمایت یافتہ ہے اور وہ جو ناپاک وجود صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے، وہ شر کی متحرک علامتیں اور غالب قوتیں ہیں۔ان کا خاتمہ پورے معاشرے کے لئے مفید ہے اور اس جنگ میں جب وہ جان سے گزرے گا تو نہ صرف اس کی وجودی کشمکش ختم ہو جائے گی بلکہ ایک نادیدہ ہر دلعزیزی بھی اس کا یقینی مقدر ہوگی۔اپنی بیوی اور بچی کھونے کے بعد، جوانی کے کئی سال پس زندان برباد کر چکنے کے بعد، وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کوئی معنی نہیں دے سکا اور جیسا کہ ابتداء میں ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ:

> ’’میرا ماضی مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں مستقبل پر سوچوں۔‘‘۱۰؎

اب موت اس کا مستقبل ہے۔لیکن وہ اپنی بے معنی زندگی کے بعد ایک بے معنی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔اس لیے جب وہ بزعم خود رؤف علوان کو قتل کر کے واپس آتا ہے تو خود سے کہتا ہے:

> ’’ہاں، اب تم اخبارات کو لکھ سکتے ہو۔میں نے رؤف علوان کو کیوں قتل کیا۔اس طرح بے معنی زندگی، بامعنی ہو جائے گی۔رؤف علوان کو قتل کرنے والی گولی نے ساتھ ہی ساتھ تمہارے ناکامی کے احساس کو بھی ختم کر دیا۔اخلاقی اصولوں سے خالی دُنیا ویسے ہے جیسے کشش ثقل کے بغیر

کائنات؟ میں کسی چیز کا طالب نہیں، سوائے ایک ایسی موت مرنے کے جس کا کوئی مقصد ہو۔''۱۱

مشہور یونانی شاعر کوافی کے الفاظ میں سید کی حالت کچھ یوں ہے کہ:

''مجھے خود کو دھوکہ دے لینے دو تا کہ مجھے اپنی زندگی خالی محسوس نہ ہو۔''

یوں سید اپنے انتقام کو اپنی ذات کی حدود سے آگے پھیلا کر اخلاقی اصولوں کی بنیاد فراہم کرتا نظر آتا ہے اور ''با مقصد موت'' اس کی آخری خواہش ہے۔لیکن نارسائی اس کا ازلی اور ابدی مقدر ہے چاہے آسودہ گھریلو زندگی کا خواب ہو، اقدام کی کوششیں ہوں یا بامعنی موت۔کافکا نے شاید کسی ایسی ہی صورتِ حال کے لیے کہا تھا کہ مقصد تو مل جاتا ہے، راستہ نہیں ملتا۔۱۲

آخر کار وہ ''بدمعاشوں'' کو ختم کرنے میں ناکام رہتا ہے اور فرار کے تمام راستے بھی اس پر بند ہو جاتے ہیں۔بُو سونگھنے والے کُتّے اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

''سید نے قبروں کے درمیان خوف سے پیچھے دیکھا، کُتوں کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔اُس نے اپنی پشت ایک مقبرے سے لگائی اور بندوق نکال کر اندھیرے میں گھورنے لگا، وہ آ رہے تھے۔بالآخر کُتّے پہنچ گئے اور اب امید نہیں رہی تھی۔بدمعاش بچ گئے تھے۔گو وقتی طور پر اس کی زندگی نے اپنے آخری الفاظ ادا کیے کہ سب کچھ بے کار چلا گیا۔''۱۳

خوابوں کے اس پرستار کا مقدر بھی رات کی دلدل کے علاوہ کچھ اور نہیں۔لیکن ناکام شخص کی ناکام زندگی پر یہ کامیاب ناول نجیب محفوظ کی تخلیقی حسیّت کی وسعتِ انجذاب کی حیران کن مثال ہے۔بظاہر سادہ سی کہانی کے اندر ایسے سوال اُٹھائے گئے ہیں کہ نہ صرف معاصر مصری معاشرے کے چہرے سے نقاب اُلٹتے ہیں بلکہ تیسری دُنیا کے موجودہ فکری انتشار، عدم تحفظ اور تشدّد کی نفسیات کا پس منظر بھی فراہم کرتے ہیں۔

نجیب محفوظ کے ناول ''آبِ نیل پہ آوارگی'' کے بعض کردار بھی اسی تجسس، اضطراب اور ذہنی کشمکش میں گھرے نظر آتے ہیں۔ایک کردار بے خیالی میں دفتری کارروائی لکھتا جاتا ہے اور بعد ازاں انکشاف ہوتا ہے کہ روشنائی تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔کاغذ پر کچھ بھی تحریر نہیں وہ محض قلم کو حرکت دیتا رہا ہے۔اس کے بعد کہیں اس کو ایک نادر الہام ہوتا ہے کہ شاید دُنیا بھر میں امن کے جو معاہدے لکھے جاتے ہیں ان کے لیے ایسے ہی قلم استعمال ہوتے ہوں گے۔اسی حوالے سے ''آبِ نیل پہ آوارگی'' کا یہ کردار افسرِ اعلیٰ سے دن بھر کی سرزنش کے بعد اپنی ذہنی یاس انگیزی اور نڈھال روح کی تھکن کو فکر انگیز کیفیت کی اس علامتی سمت کی جانب اُچھال دیتا ہے۔

''اس نے سوچا کہ یہ بات حیران کُن نہیں کہ مصریوں نے فرعون کی پرستش کی، حیرت اس بات پر ہے کہ فرعون نے خود کو دیوتا سمجھا۔''۱۴

نجیب محفوظ کی حقیقت نگاری کے سرچشموں میں اس روح کا کرب، حوصلہ اور ظرف قابلِ توجہ ہے، جو ہر

حال میں تہذیب ومعاشرت کی تنگ و تاریک، اور ہر لمحہ بے سمتی کی جانب مائل راہداریوں کے ابہام کے دھند لکے میں سے مقتول سچ کے ریزہ ریزہ وجود کے باقی ماندہ حصّے اکٹھے کرنا چاہتی ہے۔اس تناظر میں نجیب محفوظ کا اپنا بیان ملاحظہ کیجیے:

> ''آخناتون بادشاہ نے ایک قضیہ کا فیصلہ سنانے سے پہلے کہا تھا'' میں سچ سننا چاہتا ہوں تا کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ صادر ہو سکے۔'' بس میری تحریروں کی یہی اساس ہے۔میری خواہش ہے کہ بنی نوع انسان میں سوچنے والے دماغ اور زندہ ضمیر موجود رہیں۔میں دو تہذیبوں کی آغوش میں پیدا ہوا، ان کا دودھ پیا، ان کے ادب وفن سے نشو ونما پائی۔میں تیسری دُنیا کا فرد ہوں۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میرے اندر کہانیاں لکھنے کا دماغی سکون کہاں سے آ گیا کہ اس دُنیا میں تو فاقے ہیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔جی ہاں تیسری دُنیا سے آنے والے ایک آدمی کو افسانے لکھنے کے لیے ذہنی سکون کہاں سے میّسر آ گیا۔خوش قسمتی سے فن، مائل بہ کرم، ہمدرد و غمگسار ہے۔جس طرح وہ خوش باش لوگوں کا ساتھ دیتا ہے، اسی طرح فلاکت زدوں کا ساتھ بھی نہیں چھوڑتا۔''۱۵

حواشی:

۱۔　سیدعلاؤالدین، مترجم، چور اور کتے (نجیب محفوظ)، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۴

۲۔　ایضاً، ص:۹

۳۔　ایضاً، ص:۱۵

۴۔　ایضاً، ص:۲۷

۵۔　ایضاً، ص:۵۴

۶۔　ایضاً، ص:۴۳

۷۔　ایضاً، ص:۹۵

۸۔　ایضاً، ص:۹۶

۹۔　ایضاً، ص:۱۰۱

۱۰۔　ایضاً، ص:۱۱۹

۱۱۔　ایضاً، ص:۶۱

۱۲۔　محمد عاصم بٹ، مترجم، کافکا کہانیاں (فرانز کافکا)، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء)، ص:۱۷۳

۱۳۔ نجیب محفوظ،چور اور کتے ،ص:۱۱۱

۱۴۔ نیّر عباس زیدی،مترجم،آبِ نیل پہ آوارگی (نجیب محفوظ)،(لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۶ء)، ص:۲۵

۱۵۔ کشور ناہید،باقی ماندہ خواب،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص:۳۱۳

مآخذ:

۱۔ سید علاؤالدین،مترجم،چور اور کتے (نجیب محفوظ)،کراچی،۲۰۰۰ء۔

۲۔ کشور ناہید،باقی ماندہ خواب،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔

۳۔ محمد عاصم بٹ،مترجم،کافکا کہانیاں (فرانز کافکا)،اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء۔

۴۔ نیّر عباس زیدی،مترجم،آبِ نیل پہ آوارگی (نجیب محفوظ)،لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۶ء۔

☆☆☆